حدیث خیبر اگرچہ مسند ہے لیکن اس میں کئی احتمالات ہیں، اس لئے اس سے استدلال نہیں کیا جاسکتا[1]۔

۲۔ دوسری حدیث میں انصار اور مہاجرین کے معاملہ کا ذکر ہے وہ مساقات سے متعلق ہے اور مزارعت کو مساقات پر قیاس کرنا بالکل غلط ہے کیونکہ مساقات[2] مزارعت کی نسبت مضاربت سے زیادہ مشابہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ امام شافعی مزارعت کو تو ناجائز کہتے ہیں۔ اور مساقات ان کے نزدیک جائز ہے۔

اب رہی دوسری صورت یعنی مفہوم حدیث کی نوعیت کے اعتبار سے احادیث جواز مزارعت اور احادیث نہی کا مقابلہ کیا جائے، اس بارے میں علماء حدیث وفقہ نے تصریح کی ہے کہ اگر ایک طرف کی احادیث سے اصل کلی اور قانون عام مفہوم ہوتا ہو اور دوسری طرف کی حدیث کسی خاص واقعہ کو ظاہر کرتی ہو تو ثانی الذکر کے مقابلہ میں اول الذکر کو ترجیح دی جاتی ہے[3]۔

---

[1] احتمالات نکالنے کی بات تو دوسری ہے ورنہ حدیث خیبر کی جو تشریح ہم اوپر کر آئے ہیں اس میں کسی احتمال کی گنجائش نہیں ہے حقیقت یہ ہے کہ خیبر کا معاملہ آپ کے مسلک کے خلاف ایک دلیل قاطع ہے اور اس کو ٹالنے کا وہ طریقہ صحیح نہیں ہے جو آپ اختیار فرما رہے ہیں۔ آپ کو دو باتوں میں سے ایک بات لامحالہ ثابت کرنی ہوگی۔ یا تو یہ کہ حضور نے اپنی طرف سے اور دوسرے مجاہدین کی طرف سے یہودیوں کے ساتھ بٹائی پر معاملہ نہیں کیا تھا اور اپنے آخر زمانہ تک آپ اس پر عامل نہیں رہے۔ یا پھر یہ کہ معاذ اللہ حضور کے قول اور عمل میں اختلاف تھا۔

[2] مزارعت کو اگر ربوا قرار دیا جاسکتا ہے تو مساقاۃ کب اس "شائبہ ربوا" سے پاک ہے۔ باغ میں اگر کسی سال پیداوار نہ ہو تو جس شخص نے پھلوں کی بٹائی پر باغ کی رکھوالی کا ذمہ لیا ہو اس کی محنت ضائع ہو جائے گی۔ مگر باغ اپنی زمین سمیت مالک کے پاس باقی رہ جائیگا۔ اب فرمائیے کہ آخر کس معقول دلیل کی بنا پر آپ مساقات اور مزارعت میں فرق کرتے ہیں۔ غلہ کی بٹائی ناجائز اور پھلوں کی بٹائی جائز، اس بات کو سمجھنے سے ہم تو قطعی عاجز ہیں۔

[3] کوئی ایسی قولی حدیث جس سے کوئی اصل کلی یا قانون عام مستنبط ہوتا ہو کسی ایسی فعلی روایت سے منسوخ ہو سکتی ہے۔ جو اس قانون کے خلاف نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے عمل سے ثابت ہو، الا یہ کہ اس کے خصائص نبوت میں سے ہونے کی کوئی دلیل موجود ہو۔ اس کی نظیر خود عہد نبوی میں ملتی ہے۔ آپ نے حکم دیا تھا (باقی اگلے صفحہ پر دیکھیں)

اب دیکھئے کہ ایک طرف حدیث جابر ہے، جس میں ایک خاص واقعہ بیان ہوا ہے، یا معاملۂ انصار و مہاجرین والی حدیث ہے، اور دوسری طرف امتناع مزارعت کی احادیث ہیں جن میں قانون کی بیان کیا گیا ہے۔ اور ظاہر ہے کہ مذکورہ بالا اصول کے تحت احادیث جواز کے مقابلہ میں احادیث نہی ہی کو ترجیح دی جا سکتی ہے۔

(بقیہ حاشیہ صہ) اذا صلی الامام جالسا فصلوا جلوسا۔ "جب امام بیٹھ کر نماز پڑھائے تو تم بھی بیٹھ کر پڑھو" اس روایت سے ایک عام ضابطہ معلوم ہوتا ہے۔ لیکن یہ حکم اس واقعہ سے منسوخ ہو گیا کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے مرض الموت میں بیٹھ کر نماز پڑھائی اور صحابہ نے آپ کے پیچھے کھڑے ہو کر نماز ادا کی۔ یہاں ناسخ یہ خاص فعل ہی ہے نہ کہ کوئی قولی اور اصولی روایت۔ لہذا یہ ضابطہ کوئی عمومی اور کلی ضابطہ نہیں قرار دیا جا سکتا کہ جب کبھی نبی صلے اللہ علیہ وسلم سے عمل ایک طرح کا ثابت ہو اور قول دوسری طرح کا تو لازماً قول کو عمل پر ترجیح دی جائے گی۔ آپ خود غور کریں تو سمجھ سکتے ہیں کہ اس میں کیا قباحت ہے۔ اس کا تو صاف مطلب یہ ہے کہ نعوذ باللہ نبی صلے اللہ علیہ وسلم کے قول اور عمل میں تضاد تھا!

سود میں نئے مباحث کا اضافہ

از مولانا ابوالاعلیٰ صاحب مودودی

(قسط پنجم)

اصلاح کی عملی صورت

پچھلے صفحات میں جو دلائل پیش کئے گئے ہیں ان سے یہ بات قطعی طور پر ثابت ہو جاتی ہے کہ سود خواہ کسی نوعیت کا ہو بہرحال وہ انسانی تمدن و معیشت میں سراسر ایک تخریبی طاقت ہے اور ان اہم ترین اسباب میں سے ہے جو ہماری اخلاقی و مادی زندگی میں بگاڑ پیدا کرتے ہیں۔ اسکے بعد کسی معقول آدمی کو یہ ماننے میں تامل نہیں ہو سکتا کہ ایک صالح معاشرے میں سود کو حرام ہونا چاہئے۔ اب صرف آخری سوال باقی رہ جاتا ہے جس کا ہمیں جواب دینا ہے، در وہ یہ ہے کہ "کیا فی الواقع سود کو ساقط کر کے ایک ایسا نظام مالیات قائم کیا جاسکتا ہے جو موجودہ زمانے میں ایک ترقی پذیر معاشرے اور ریاست کی ضروریات کے لئے کافی ہو؟"

چند غلط فہمیاں اس سوال پر گفتگو شروع کرنے سے پہلے ضروری ہے کہ بعض ایسی غلط فہمیوں کو صاف کر دیا جائے جو نہ صرف اِس معاملہ میں بلکہ عملی اصلاح کے ہر معاملہ میں لوگوں کے ذہنوں کو الجھایا کرتی ہیں۔

سب سے پہلی غلط فہمی تو وہی ہے جس کی بنا پر مذکورہ بالا سوال پیدا ہوا ہے۔ کسی چیز کو غلط تسلیم کر لینے کے بعد لوگوں کا یہ پوچھنا کہ "کیا اس کے بغیر کام چل بھی سکتا ہے؟" اور اصلاح کی کسی تجویز کو صحیح و برحق مان لینے کے بعد یہ سوال کرنا کہ "کیا یہ قابل عمل بھی ہے؟" دوسرے الفاظ میں یہ کہنا ہے کہ خدا کی اس خدائی میں کوئی غلطی ناگزیر بھی ہے اور کوئی راستی ناقابل عمل بھی پائی جاتی ہے یہ دراصل فطرت اور اس کے نظام کے خلاف عدم اعتماد کا ووٹ ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ ہم ایک

ایسے فاسد نظام کائنات میں سانس لے رہے ہیں جس میں ہماری بعض حقیقی ضرورتیں غلطیوں اور بدکاریوں سے وابستہ کر دی گئی ہیں اور بعض بھلائیوں کے دروازے جان بوجھ کر ہم پر بند کر دئے گئے ہیں۔ بلکہ اس سے بھی گذر کر یہ بات ہمیں اس نتیجہ پر پہنچاتی ہے کہ فطرت خود اس قدر ٹیڑھی اور اوندھی واقع ہوئی ہے کہ جو کچھ خود اُس کے اپنے قوانین کی رو سے غلط ہے وہی اس کے نظام میں مفید اور ضروری اور قابلِ عمل ہے اور جو کچھ اُس کے قوانین کی رو سے صحیح ہے وہی اس کے نظام میں غیر مفید یا غیر ضروری یا ناقابل عمل ہے!

کیا واقعی ہماری عقل اور ہمارے علوم اور ہمارے تاریخی تجربات مزاج فطرت کو اسی بدگمانی کا مستحق ثابت کرتے ہیں؟ کیا یہ سچ ہے کہ فطرت بگاڑ کی حامی اور بناؤ کی دشمن ہے؟ اگر یہ بات ہے تب تو ہمیں اشیاء کی صحت اور غلطی کے متعلق اپنی ساری بحثیں لپیٹ کر رکھ دینی چاہئیں اور سیدھی طرح زندگی سے استعفا دے دینا چاہئے۔ کیونکہ اس کے بعد تو ہمارے لئے امّید کی ایک کرن بھی اس دنیا میں باقی نہیں رہتی۔ لیکن اگر ہماری اور کائنات کی فطرت اِس سوءظن کے لائق نہیں ہے تو پھر ہمیں یہ اندازِ فکر چھوڑ دینا چاہئے کہ "فلاں چیز ہے تو بُری مگر کام اُسی سے چلتا ہے' اور فلاں چیز ہے تو برحق مگر چلنے والی چیز نہیں ہے"۔

حقیقت یہ ہے کہ دنیا میں جو طریقہ بھی رواج پا جاتا ہے۔ انسانی معاملات اِسی سے وابستہ ہو جاتے ہیں اور اس کو بدل کر دوسرے طریقے کو چلانا مشکل نظر آنے لگتا ہے۔ ہر رائج الوقت طریقے کا یہی حال ہے' خواہ وُہ طریقہ بجائے خود صحیح ہو یا غلط۔ دشواری جو کچھ بھی ہے تغیر میں ہے اور سہولت کی اصل وجہ جمود کے سوا کچھ نہیں۔ مگر نادان لوگ اس سے دھوکا کھا کر یہ سمجھ بیٹھتے ہیں کہ جو غلطی رائج ہو چکی ہے انسانی معاملات بس اسی پر چل سکتے ہیں اور اس کے سوا دوسرا کوئی طریقہ قابل عمل ہی نہیں ہے۔

دوسری غلط فہمی اِس معاملہ میں یہ ہے کہ لوگ تغیر کی دشواری کے اصل اسباب کو نہیں سمجھتے اور خواہ مخواہ تجویز تغیر کے سر پر ناقابل عمل ہونے کا الزام تھوپنے لگتے ہیں۔ آپ انسانی سعی کے امکانات کا جت

ہی غلط اندازہ لگائیں گے اگر رائج الوقت نظام کے خلاف کسی تجویز کو بھی ناقابل عمل سمجھیں گے۔ جس دُنیا میں انفرادی ملکیت کی تنسیخ اور اجتماعی ملک کی ترویج جیسی انتہائی انقلاب انگیز تجویز کو عمل میں لاکر دکھا دیا گیا ہو وہاں یہ کہنا کس قدر لغو ہے کہ سود کی تنسیخ اور زکوٰۃ کی تنظیم جیسی معتدل تجویزیں قابل عمل نہیں ہیں۔ البتہ یہ صحیح ہے کہ رائج الوقت نظام کو بدل کر کسی دوسرے نقشے پر زندگی کی تعمیر کرنا ہر عمرو زید کے بس کا کام نہیں ہے۔ یہ کام صرف وہ لوگ کر سکتے ہیں جن میں دو شرطیں پائی جاتی ہوں:۔

ایک یہ کہ وہ فی الحقیقت پرانے نظام سے منحرف ہو چکے ہوں اور سچے دل سے کسی تجویز پر ایمان رکھتے ہوں جس کے مطابق نظام زندگی میں تغیر کرنا پیش نظر ہے۔

دوسرے یہ کہ ان میں تقلیدی ذہانت کے بجائے اجتہادی ذہانت پائی جاتی ہو۔ وہ محض اُس قسم کی سی ذہانت کے مالک نہ ہوں جو پرانے نظام کو اُس کے اماموں کی طرح چلائے جانے کے لئے کافی ہوتی ہے بلکہ اُس درجے کی ذہانت رکھتے ہوں جو پامال راہوں کو چھوڑ کر نئی راہ بنانے کے لئے درکار ہوتی ہے۔

یہ دو شرطیں جن لوگوں میں پائی جاتی ہوں وہ کمیونزم اور نازی ازم اور فاشزم جیسے سخت انقلابی مسلکوں کی تجاویز تک عمل میں لا سکتے ہیں۔ اور ان شرطوں کا جن میں فقدان ہو وہ اسلام کی تجویز کے ہوتے انتہائی معتدل تغیرات کو بھی نافذ نہیں کر سکتے۔

ایک چھوٹی سی غلط فہمی اس معاملہ میں اور بھی ہے۔ تعمیری تنقید اور اصلاحی تجویز کے جواب میں جب عمل کا نقشہ مانگا جاتا ہے تو کچھ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ لوگوں کے نزدیک عمل کی جگہ شاید کاغذ ہے۔ حالانکہ عمل کاغذ پر نہیں زمین پر ہوا کرتا ہے۔ کاغذ پر کرنے کا اصل کام تو صرف یہ ہے کہ دلائل اور شواہد سے نظام حاضر کی غلطیاں اور اُن کی مضرتیں واضح کر دی جائیں اور ان کی جگہ جو اصلاحی تجویزیں ہم عمل میں لانا چاہتے ہیں اِن کی معقولیت ثابت کر دی جائے۔ اس کے بعد جو مسائل عمل سے تعلق رکھتے ہیں اُن کے بارے میں کاغذ پر اس سے زیادہ کچھ نہیں کیا جا سکتا کہ لوگوں کو ایک عام تصور اس امر کا دیدیا جائے کہ پرانے نظام کے غلط طریقوں کو کس طرح مٹایا جا سکتا ہے اور ان کی جگہ نئی تجویزیں کیونکر عمل میں لائی جا سکتی ہیں۔ رہا یہ کہ اس شکست و ریخت کی تفصیلی صورت کیا ہوگی اور اسکے جزئی مراحل

کیا ہونگے اور ہر مرحلے میں پیش آنے والے مسائل کو حل کیسے کیا جائیگا' تو ان امور کو نہ تو کوئی شخص پیشگی جان سکتا ہے اور نہ کوئی جواب دے سکتا ہے۔ آپ اگر اس امر پر مطمئن ہو چکے ہوں کہ موجودہ نظام واقعی غلط ہے اور اصلاح کی تجویز بالکل معقول ہے تو عمل کی طرف قدم اُٹھائیے اور زمامِ کار ایسے لوگوں کے ہاتھ میں دیجئے جو ایمان اور اجتہادی ذہانت رکھتے ہوں۔ پھر جو عملی مسئلہ جہاں پیدا ہوگا اسی جگہ وہ حل ہو جائیگا۔ زمین پر چلنے کا کام آخر کاغذ پر کرکے کیسے دکھایا جا سکتا ہے؟

اس توضیح کے بعد یہ کہنے کی ضرورت باقی نہیں رہتی کہ اس باب میں جو کچھ ہم پیش کریں گے وہ غیر سودی مالیات کا کوئی تفصیلی نقشہ نہ ہوگا بلکہ اس چیز کا صرف ایک عام تصور ہوگا کہ سود کو اجتماعی مالیات سے خارج کرنے کی عملی صورت کیا ہو سکتی ہے اور وہ بڑے بڑے مسائل جو اخراجِ سود کا خیال کرتے ہی بادی النظر میں آدمی کے سامنے آ جاتے ہیں کس طرح حل کیے جا سکتے ہیں۔

اصلاح کی راہ میں پہلا قدم پچھلے تین ابواب میں سود کی خرابیوں پر جو تفصیلی بحث کی گئی ہے اس سے یہ بات واضح ہو چکی ہے کہ اجتماعی معیشت اور نظامِ مالیات میں یہ سب خرابیاں صرف اس وجہ سے پیدا ہوتی ہیں کہ قانون نے سود کو جائز کر رکھا ہے۔ ظاہر بات ہے کہ جب ایک آدمی کے لئے سود کا دروازہ کھلا ہوا ہے تو وہ اپنے ہمسائے کو قرضِ حسن کیوں دے' اور ایک کاروباری آدمی کے ساتھ نفع و نقصان کی شرکت کیوں اختیار کرے' اور اپنی قومی ضروریات کی تکمیل کے لئے مخلصانہ اعانت کا ہاتھ کیوں بڑھائے' اور کیوں نہ اپنا جمع کیا ہوا سرمایہ ساہوکار کے حوالہ کر دے جبکہ اسے گھر بیٹھے ایک لگا بندھا منافع ملنے کی امید ہو۔ آپ انسانی فطرت کے بُرے میلانات کو ابھرنے اور کُھل کھیلنے کی کھُلی چھٹی دے دینے کے بعد یہ توقع نہیں کر سکتے کہ بڑے وعظ و تلقین اور اخلاقی اپیلوں کے ذریعہ ہی سے آپ اُن کے نشو و نما اور نقصانات کو روک سکیں گے۔ پھر یہاں تو معاملہ صرف اس حد تک بھی محدود نہیں ہے کہ آپ نے ایک برے میلان کو محض کھلی چھٹی دے رکھی ہو۔ اس سے آگے آپ کا قانون تو اُلٹا اُس کا مددگار بنا ہوا ہے اور حکومت خود اسی برائی پر اجتماعی مالیات کے نظام کو چلا اور چلوا رہی ہے۔ اس حالت میں آخر یہ کس طرح ممکن ہے کہ کسی قسم کی جزوی ترمیمات اور فروعی اصلاحات سے اس کی برائیوں کا سدِّباب کیا

جا سکے۔ اِن کا سدِّ باب اگر ہو سکتا ہے تو صرف اس طرح کہ سب سے پہلے اس دروازے کو بند کیا جائے جس سے خرابی آ رہی ہے۔

جو لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ پہلے کوئی غیر سودی نظامِ مالیات بن کر تیار ہو لے، پھر سود یا تو آپ سے آپ بند ہو جائیگا، یا اسے قانوناً بند کر دیا جائے گا، وہ درحقیقت گھوڑے کے آگے گاڑی باندھنا چاہتے ہیں۔ جب تک از روئے قانون جائز ہے، جب تک عدالتیں سودی معاہدوں کو تسلیم کر کے ان کو بزورِ نافذ کر رہی ہیں، اور جب تک ساہوکاروں کے لئے یہ دروازہ کھلا ہے کہ سود کا لالچ دے کر گھر گھر سے روپیہ اکٹھا کریں اور پھر اسے سود پر چلائیں، اس وقت تک یہ ممکن ہی نہیں ہے کہ کوئی غیر سودی نظامِ مالیات وجود میں آئے اور نشو و نما پا سکے۔ لہٰذا اگر سود کی بندش اس امر پر موقوف ہے کہ پہلے ایسا کوئی مالی نظام چل کر جوان ہو لے جو موجودہ سودی نظام کی جگہ لے سکتا ہو تو یقین رکھئے کہ اس طرح قیامت تک سود کے بند ہونے کی نوبت نہیں آ سکتی۔ یہ کام تو جب کبھی کرنا ہو اسی طرح کرنا پڑے گا کہ اول قدم ہی پر سود کو از روئے قانون بند کر دیا جائے۔ پھر خود بخود ایک غیر سودی نظامِ مالیات پیدا ہو جائیگا اور ضرورت، جو ایجاد کی ماں ہے، آپ سے آپ اس کے لئے ہر گوشے میں بڑھنے اور پھیلنے کا راستہ بناتی چلی جائے گی۔

سود نفسِ انسانی کی جن بری صفات کا نتیجہ ہے اُن کی جڑیں اس قدر گہری اور ان کے تقاضے اس قدر طاقتور ہیں کہ ادھوری کارروائیوں اور ٹھنڈی ٹھنڈی تدبیروں سے کسی معاشرے میں اس بلا کا استیصال نہیں کیا جا سکتا۔ اس غرض کے لئے تو ضروری ہے کہ وہ ساری تدبیریں عمل میں لائی جائیں جو اسلام تجویز کرتا ہے۔ اُسی سرگرمی کے ساتھ اس کے خلاف نبرد آزمائی کی جائے جیسی کہ اسلام چاہتا ہے۔ اسلام سودی کاروبار کی محض اخلاقی مذمت پر اکتفا نہیں کرتا بلکہ ایک طرف وہ اس کو مذہبی حیثیت سے حرام قرار دے کر اس کے خلاف شدید نفرت پیدا کرتا ہے۔ دوسری طرف جہاں جہاں اس کا سیاسی اقتدار اور حاکمانہ اثر و نفوذ جاری ہو وہاں وہ ملکی قانون کے ذریعہ سے اس کو ممنوع قرار دیتا ہے، تمام سودی معاہدوں کو کالعدم ٹھیراتا ہے، سود لینے اور دینے اور اس کی دستاویز لکھنے اور

اس پر گواہ بننے کو فوجداری جرم قابل دست اندازی پولیس قرار دیتا ہے، اور اگر کہیں یہ کاربار معمولی سزاؤں سے بند نہ ہو تو اس کے مرتکبین کو قتل اور ضبطی جائداد تک کی سزائیں دیتا ہے۔ تیسری طرف وہ زکوٰۃ کو فرض قرار دے کر اور حکومت کے ذریعہ سے اس کی تحصیل و تقسیم کا انتظام کر کے ایک دوسرے نظام مالیات کی داغ بیل ڈال دیتا ہے۔ اور ان سب تدبیروں کے ساتھ وہ تعلیم و تربیت اور دعوت و تبلیغ کے ذریعہ عامۃ الناس کی اخلاقی اصلاح بھی کرتا ہے تاکہ ان کے نفس میں وہ صفات اور رجحانات دب جائیں جو سود خواری کے موجب ہوتے ہیں، اور اس کے برعکس وہ صفات اور جذبات ان کے اندر نشو و نما پائیں جن سے معاشرے میں ہمدردانہ و فیاضانہ تعاون کی روح جاری و ساری ہو سکے۔

جو کوئی فی الواقع سنجیدگی و اخلاص کے ساتھ سود کا انسداد کرنا چاہتا ہو اسے یہ سب کچھ اسی طرح کرنا ہوگا۔

انسداد سود کے نتائج سود کی یہ قانونی بندش، جب کہ اس کے ساتھ زکوٰۃ کی تحصیل و تقسیم کا اجتماعی انتظام بھی ہو، مالیات کے نقطۂ نظر سے تین بڑے نتائج پر منتج ہوگی:۔

(۱) اس کا اولین اور سب سے اہم نتیجہ یہ ہوگا کہ اجتماع سرمایہ کی موجودہ فساد انگیز صورت ایک صحیح اور صحت بخش صورت سے بدل جائیگی۔

موجودہ صورت میں تو سرمایہ اس طرح جمع ہوتا ہے کہ ہمارا اجتماعی نظام بخل اور جمع مال کے اس میلان کو جو ہر انسان کے اندر طبعاً تھوڑا بہت موجود ہے، اپنی مصنوعی تدبیروں سے انتہائی مبالغے کی حد تک بڑھا دیتا ہے اور اُسے خوف اور لالچ، دونوں ذرائع سے اس بات پر آمادہ کرتا ہے کہ اپنی آمدنی کا کم سے کم حصّہ خرچ اور زیادہ سے زیادہ حصہ جمع کرے۔ وہ اس سے کہتا ہے کہ جمع کر کیونکہ پورے معاشرے میں کوئی نہیں ہے جو تیرے بُرے وقت پہ کام آئے، اور جمع کر کیونکہ اس کا اجر تجھے سود کی شکل میں ملیگا۔ اس دوہری تحریص کی وجہ سے معاشرے کے وہ تمام افراد جو قدر کفاف سے کچھ بھی زائد آمدنی رکھتے ہیں، خرچ روکنے اور جمع کرنے پر تُل جاتے ہیں، اور اس کا نتیجہ یہ ہوتا کہ منڈیوں میں اموال تجارت کی کھپت امکانی حد سے بہت کم ہوتی ہے۔ کھپت کی کمی روزگار کی

کمی پر اور روزگار کی کمی آمدنیوں کی کمی پر منتج ہوتی ہے۔ اور آمدنیاں جتنی کم ہوتی جاتی ہیں، صنعت وتجارت کی ترقی کے امکانات بھی اسی کے مطابق کم اور اجتماعِ سرمایہ کے مواقع کم تر ہوتے چلے جاتے ہیں اس طرح چند افراد کے اندوختوں کا بڑھنا اجتماعی معیشت کے گھٹنے کا موجب ہوتا ہے۔ ایک آدمی ایسے طریقہ سے اپنی پس انداز کی ہوئی رقموں میں اضافہ کرتا ہے۔ جس سے ہزار آدمی سرے سے کچھ کمانے ہی کے قابل نہیں رہتے کجا کہ کچھ پس انداز کر سکیں۔

اس کے برعکس جب سود بند کر دیا جائے گا اور زکوٰۃ کی تنظیم کر کے ریاست کی طرف سے معاشرے کے ہر فرد کو اس امر کا اطمینان دلا دیا جائے کہ بُرے وقت پر اس کی دستگیری کا انتظام موجود ہے تو بخل و زر اندوزی کے غیر فطری اسباب و محرکات ختم ہو جائینگے۔ لوگ دل کھول کر خود بھی خرچ کرینگے اور نادار افراد کو بھی زکوٰۃ کے ذریعہ سے اتنی قوت خریداری بہم پہنچا دیں گے کہ وہ خرچ کریں۔ اس سے صنعت و تجارت بڑھے گی۔ صنعت و تجارت کے بڑھنے سے روزگار بڑھیگا روزگار بڑھنے سے آمدنیاں بڑھیں گی۔ ایسے ماحول میں اول تو صنعت و تجارت کا اپنا منافع ہی اتنا بڑھ جائیگا کہ اس ۔ خارجی سرمایہ کی اُتنی احتیاج باقی نہ رہے گی جتنی اب ہوتی ہے۔ پھر جس حد تک بھی اسے سرمایہ کی حاجت ہوگی وہ موجودہ حالت کی بہ نسبت بہت زیادہ سہولت کے ساتھ بہم پہنچ سکیگا۔ کیونکہ اُس وقت پس انداز کرنے کا سلسلہ بالکل بند نہیں ہو جائیگا' جیسا کہ بعض لوگ گمان کرتے ہیں' بلکہ کچھ لوگ تو اپنی پیدائشی افتادِ طبع کی بنا پر ہی اندوختہ کرتے رہیں گے' اور بیشتر لوگ آمدنیوں کی کثرت اور کمالِ آسودگی کی وجہ سے مجبوراً پس انداز کریں گے۔ اس وقت یہ پس اندازی کسی بخل یا خوف یا لالچ کی بنا پر نہ ہوگی' بلکہ اس کی وجہ صرف یہ ہوگی کہ لوگ اپنی ضرورت سے زیادہ کمائینگے اسلام کی جائز کی ہوئی مدات خرچ میں خوب دل کھول خرچ کرنے کے باوجود ان کے پاس بہت کچھ بچ رہے گا۔ اس بچی ہوئی دولت کو لینے والا کوئی محتاج آدمی بھی انکو نہ ملیگا' اس لئے وہ اسے ڈال رکھیں گے اور بڑی اچھی شرائط پر اپنی حکومت کو' اپنے ملک کی صنعت و تجارت کو' اور ہمسایہ ملکوں تک کو سرمایہ دینے کے لئے آمادہ ہو جائیں گے۔

(۲) دوسرا نتیجہ یہ ہو گا کہ جمع شدہ سرمایہ رُکنے کے بجائے چلنے کی طرف مائل رہیگا اور اجتماعی معیشت کی کھیتیوں کو اُن کی حاجت کے مطابق اور ضروریات کے موقع پر برابر ملتا چلا جائے گا۔ موجودہ نظام میں سرمایہ کو کاروبار کی طرف جانے کے لئے جو چیز آمادہ کرتی ہے وہ سود کا لالچ ہے، مگر یہی چیز اُس کے رُکنے کا سبب بھی بنتی ہے۔ کیونکہ سرمایہ اکثر اس انتظار میں ٹھیرا رہتا ہے کہ زیادہ شرح سود ملے تو وہ کام میں لگے۔ نیز یہی چیز سرمایہ کے مزاج کو کاروبار کے مزاج سے منحرف بھی کر دیتی ہے۔ جب کاروبار چاہتا ہے کہ سرمایہ آئے تو سرمایہ کڑ جاتا ہے اور اپنی شرائط سخت کرتا چلا جاتا ہے۔ اور جب معاملہ برعکس ہوتا ہے تو سرمایہ کاروبار کے پیچھے دوڑتا ہے اور ہلکی شرائط پر برا چھے برے کام میں لگنے کو تیار ہو جاتا ہے۔ لیکن جب سود کا دروازہ ازروئے قانون بند ہو جائیگا، اور تمام جمع شدہ رقموں پر الٹی زکوٰۃ ۲½ فی صدی سالانہ کے حساب سے لگنی شروع ہو گی تو سرمایہ کی یہ بدمزاجی ختم ہو جائے گی وہ خود اس بات کا خواہشمند ہو گا کہ معقول شرائط پر جلدی سے جلدی کاروبار میں لگ جائے اور ٹھیرنے کے بجائے ہمیشہ کاروبار ہی میں لگا رہے۔

(۳) تیسرا نتیجہ یہ ہو گا کہ کاروباری مالیات اور مالیات قرض کی مدیں بالکل الگ ہو جائینگی موجودہ نظام میں تو سرمایہ کی بہم رسانی زیادہ تر، بلکہ قریب قریب تمام تر ہوتی ہی صرف قرض کی صورت میں ہے، خواہ وہ پیہ لینے والا شخص یا ادارہ کسی نفع آور کام کے لئے لے یا غیر نفع آور کام کے لئے، اور خواہ عارضی ضرورت کے لئے لے یا کسی طویل المدت تجویز کے لیے۔ ہر صورت میں سرمایہ صرف ایک ہی شرط پر ملتا ہے اور وہ یہ ہے کہ ایک مقرر شرح سود پر اسے قرض حاصل کیا جائے۔ لیکن جب سود ممنوع ہو جائیگا تو قرض کی مد صرف غیر نفع آور اغراض کے لئے، یا جہاں تک کاروبار کا تعلق ہے عارضی ضروریات کے لئے مخصوص ہو جائے گی اور اس کا انتظام قرض حسن کے اصول پر کرنا ہو گا۔ رہیں اغراض، خواہ وہ صنعت و تجارت وغیرہ سے متعلق ہوں یا حکومتوں اور پبلک اداروں کی نفع بخش تجویزوں سے متعلق، ان سب کے لئے سرمایہ کی فراہمی قرض کے بجائے مضاربت (حصہ داری) کے اصول پر ہو گی۔

اب ہم اختصار کے ساتھ بتائیں گے کہ غیر سودی نظام مالیات میں یہ دونوں شعبے کس طرح کام کر سکتے ہیں۔

غیر سودی مالیات میں فراہمی قرض کی صورتیں پہلے قرض کے شعبے کو لیجئے، کیونکہ لوگ سب سے بڑھ کر جس شک میں مبتلا ہیں وہ یہی ہے کہ سود بند ہونے کے بعد قرض ملنا بھی بند ہو جائے گا۔ لہذا پہلے ہم یہی دکھائیں گے کہ اس ناپاک روکاٹ کے دور ہو جانے سے قرض کی فراہمی صرف یہی نہیں کہ بند نہ ہوگی، بلکہ موجودہ حالت سے زیادہ آسان ہوگی اور بدرجہا زیادہ بہتر صورت اختیار کرے گی۔

شخصی حاجات کے لئے موجودہ نظام میں شخصی حاجات کے لئے فراہمی قرض کی صرف ایک ہی صورت ہے، اور وہ یہ ہے کہ غریب آدمی مہاجن سے، اور صاحب جائداد آدمی بینک سے سودی قرض حاصل کرے۔ دونوں صورتوں میں ہر طالب قرض کو ہر غرض کے لئے ہر مقدار میں روپیہ مل سکتا ہے اگر وہ مہاجن یا بینکر کو اصل و سود کے ملتے رہنے کا اطمینان دلا سکتا ہو، قطع نظر اس سے کہ وہ گناہ گاریوں کے لئے لینا چاہتا ہو یا فضول خرچیوں کے لئے یا حقیقی ضرورتوں کے لئے۔ بخلاف اس کے کوئی طالب قرض کہیں سے ایک پیسہ نہیں پا سکتا۔ اگر وہ اصل و سود کے ملنے کا اطمینان نہ دلا سکتا ہو، چاہے اسکے گھر ایک مردہ لاش ہی بے گور و کفن کیوں نہ پڑی ہو۔ پھر موجودہ نظام میں کسی غریب کی مصیبت اور کسی امیرزادے کی آوارگی، دونوں ہی ساہوکار کے لئے کمائی کے بہترین مواقع ہیں، اور اس خود غرضی کے ساتھ سنگ دلی کا یہ حال ہے کہ جو شخص سودی قرض کے جال میں پھنس چکا ہے اس کے ساتھ نہ سود کی تحصیل میں کوئی رعایت ہے نہ اصل کی بازیافت میں۔ کوئی یہ دیکھنے کے لئے دل ہی نہیں رکھتا کہ جس شخص سے ہم اصل و سود کا مطالبہ کر رہے ہیں وہ کمبخت کس حال میں مبتلا ہے —— یہ ہیں وہ "آسانیاں" جو موجودہ نظام شخصی حاجات میں فراہمی قرض کے لئے بہم پہنچاتا ہے۔ اب دیکھئے کہ اسلام کا غیر سودی آفاقی نظام اس چیز کا انتظام کس طرح کرے گا۔

اول تو اُس نظام میں فضول خرچیوں اور گناہ گاریوں کے لئے قرض کا دروازہ بند ہو جائے گا، کیونکہ وہاں سود کے لالچ میں بے جا قرض دینے والا کوئی نہ ہوگا۔ اس حالت میں قرض کا سارا لین دین

آپ سے آپ صرف معقول ضروریات تک محدود ہو جائیگا اور اُتنی ہی رقمیں لی اور دی جائیں گی جو مختلف انفرادی حالات میں صریح طور پر مناسب نظر آئینگی۔

پھر چونکہ اس نظام میں قرض لینے والے سے کسی نوعیت کا فائدہ اُٹھانا قرض دینے والے کے لئے جائز نہ ہوگا۔ اس لئے قرضوں کی واپسی زیادہ سے زیادہ آسان ہو جائے گی۔ کم سے کم آمدنی رکھنے والا بھی تھوڑی تھوڑی قسطیں دے کر بار قرض سے جلدی اور بآسانی سبکدوش ہو سکے گا۔ جو شخص کوئی زمین یا مکان یا اور کسی قسم کی جائداد رہن رکھے گا اس کی آمدنی سود میں کھپنے کے بجائے اصل میں وضع ہو گی اور اس طرح جلدی سے جلدی رقم قرض کی بازیافت ہو جائیگی۔ اتنی آسانیوں کے باوجود اگر شاذ و نادر کسی معاملہ میں کوئی قرض ادا ہونے سے رہ جائے تو بیت المال ہر آدمی کی پشت پر موجود ہوگا جو ادائیگی قرض میں اس کی مدد کرے گا' اور بالفرض اگر مدیون کچھ چھوڑے بغیر مر جائے تب بھی بیت المال اس کا قرض ادا کرنے کا ذمہ دار ہوگا۔ ان وجوہ سے خوشحال و ذی استطاعت لوگوں کے لئے اپنے کسی حاجت مند ہمسائے کی ضرورت کے موقع پر اسے قرض دینا اُتنا مشکل اور ناگوار کام نہ رہیگا۔ جتنا اب موجودہ نظام میں ہے۔

اس پر بھی اگر کسی بندۂ خدا کو اس کے محلّے یا بستی سے قرض نہ ملے گا تو بیت المال کا دروازہ اس کے لئے کھلا ہوگا۔ وہ جائیگا اور وہاں سے بآسانی قرض حاصل کر لے گا۔ لیکن یہ واضح رہنا چاہئے کہ بیت المال سے استمداد ان اغراض کے لئے آخری چارۂ کار ہے۔ اسلامی نقطۂ نظر سے شخصی حاجات میں ایک دوسرے کو قرض دینا معاشرے کے افراد کا اپنا فرض ہے اور ایک معاشرے کی صحت مندی کا معیار یہی ہے کہ اسکے افراد اپنی اس طرح کی اخلاقی ذمہ داریوں کو خود ہی محسوس اور ادا کرتے رہیں۔ اگر کسی بستی کا کوئی باشندہ اپنے ہمسایوں سے قرض نہیں پاتا اور مجبور ہو کر بیت المال کی طرف رجوع کرتا ہے تو یہ صریحًا اس بات کی علامت ہے کہ اُس بستی کی اخلاقی آب و ہوا بگڑی ہوئی ہے۔ اس لئے جس وقت اس قسم کا کوئی معاملہ بیت المال میں پہنچ گا تو وہاں صرف اُس طالب قرض کی حاجت پوری کرنے ہی پر اکتفا نہ کیا جائے گا بلکہ فورًا اخلاق حفظانِ صحت کے محکمے کو اس "واردات" کی اطلاع

دی جائیگی اور وہ اسی وقت اُس بیمار بستی کی طرف توجہ کرے گا جس کے باشندے اپنے ایک بھائی کی ضرورت کے وقت اس کے کام نہ آئے۔ اِس طرح کے کسی واقعہ کی اطلاع ایک صالح اخلاقی نظام میں وہی اضطراب پیدا کرے گی جو ہیضہ یا طاعون کے کسی واقعہ کی اطلاع ایک مادّہ پرست نظام میں پیدا کیا کرتی ہے۔

شخصی حاجات کے لئے قرض فراہم کرنے کی ایک اور صورت بھی اسلامی نظام میں اختیار کی جا سکتی ہے وہ یہ کہ تمام تجارتی کمپنیوں اور کاروباری اداروں پر اُن کے ملازموں اور مزدوروں کے جو کم سے کم حقوق ازروئے قانون مقرر کئے جائیں اُن میں ایک حق یہ بھی ہو کہ وہ اُن کی غیر معمولی ضرورت کے مواقع پر اُن کو قرض دیا کریں۔ نیز حکومت خود بھی اپنے اوپر ملازموں کا یہ حق تسلیم کرے اور اس کو فیاضی کے ساتھ ادا کرے۔ یہ معاملہ حقیقت میں صرف اخلاقی نوعیت ہی نہیں رکھتا بلکہ اس کی معاشی و سیاسی اہمیت بھی اُتنی ہی ہے جتنی اِس کی اخلاقی اہمیت ہے۔ آپ اپنے ملازموں اور مزدوروں کے لئے غیر سودی قرض کی سہولت بہم پہنچائینگے تو صرف ایک نیکی ہی کریں گے بلکہ اُن اسباب میں سے ایک سبب کو دور کر دینگے جو آپ کے کارکنوں کو فکر پریشانی، خستہ حالی، جسمانی آزار اور مادّی بربادی میں مبتلا کرتے ہیں۔ اِن بلاؤں سے اُن کی حفاظت کیجئے۔ اُن کی آسودگی اُن کی قوتِ کار بڑھائے گی اور اُن کا اطمینان انہیں فساد انگیز فلسفوں سے بچائیگا۔ اِس کا نفع بظاہر کھاتے کی رو سے چاہے کچھ نہ ہو۔ لیکن کسی کو عقل کی بینائی میسر ہو تو وہ بآسانی دیکھ سکتا ہے کہ مجموعی طور پر پورے معاشرے ہی کے لئے نہیں، بلکہ فرداً فرداً ایک ایک سرمایہ دار و کارخانہ دار کے لئے اور ایک ایک معاشی و سیاسی ادارے کے لئے اُس کا نفع اُس سود سے بہت زیادہ قیمتی ہوگا جو آج مادّہ پرست نظام میں محض احمقانہ تنگ نظری کی بنا پر وصول کیا جا رہا ہے۔

کاروباری اغراض کے لئے اس کے بعد اُن قرضوں کا معاملہ لیجئے جو کاروباری لوگوں کو اپنی آئے دن کی ضروریات کے لئے درکار ہوتے ہیں۔ موجودہ زمانہ میں ان مقاصد کے لئے یا تو بینکوں براہ راست قلیل المدت قرضے (Short term Loans) حاصل کئے جاتے

ہیں، اور ہنڈیاں (Bills of Exchange) بھنائی جاتی ہیں[1]۔ ان دونوں صورتوں میں بینک ایک ہلکی سی شرح سود اس پر لگاتے ہیں۔ یہ تجارت کی ایک ایسی اہم ضرورت ہے جس کے بغیر کوئی کام آج تک نہیں چل سکتا۔ اس لئے جب کاروباری لوگ بندشِ سود کا نام سنتے ہیں تو انہیں سب سے پہلے جو فکر لاحق ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ پھر روزمرہ کی ان ضروریات کے لئے قرض کیسے ملیگا؟ اگر بینک کو سود کا لالچ نہ ہو تو آخر وہ کیوں ہمیں قرض دے گا اور کیوں ہماری ہنڈیاں بھنائے گا؟

لیکن سوال یہ ہے کہ جس بینک کے پاس تمام رقومِ امانت (Deposits) جا کر جمع ہوں، اور جس کے پاس خود ان تاجروں کا بھی لاکھوں روپیہ بلا سود رکھا رہتا ہو، وہ آخر کیوں نہ اُن کو بلا سود قرض دے اور کیوں نہ ان کی ہنڈیاں بھنائے؟ وہ اگر سیدھی طرح اس پر راضی نہ ہوگا تو تجارتی قانون کے ذریعہ سے اس کو مجبور کیا جائے گا کہ وہ اپنے کھاتہ داروں (Customers) کو یہ سہولت بہم پہنچائے۔ اُس کے فرائض میں یہ چیز شامل ہونی چاہیئے۔

درحقیقت اِس کام کے لئے خود تاجروں کی اپنی رکھوائی ہوئی رقمیں ہی کافی ہو سکتی ہیں، لیکن

---

[1] یہ وہی چیز ہے جس کے لئے ہماری اسلامی فقہ میں "سفاتج" کی اصطلاح استعمال کی جاتی ہے۔ اس کا طریقہ یہ ہے کہ جن تاجروں کا آپس میں بھی ایک دوسرے سے لین دین ہو اور بینک کے ساتھ بھی معاملہ ہو، وہ نقد رقم ادا کئے بغیر بڑی مقدار میں ایک دوسرے سے مال قرض لے لیتے ہیں، اور مہینہ، دو مہینے، چار مہینے کے لئے فریقِ ثانی کو ہنڈی لکھ کر دے دیتے ہیں۔ اگر فریقِ ثانی اس مدت مقررہ تک انتظار کر سکتا ہو تو انتظار کرتا ہے اور وقت آنے پر قرض ادا ہو جاتا ہے۔ لیکن اگر درمیانی مدت میں اُس کو روپے کی ضرورت پڑ جاتی ہے تو وہ اس ہنڈی کو اس بینک میں داخل کر دیتا ہے جس سے دونوں فریقوں کا لین دین ہو اور اس سے رقم حاصل کر کے اپنا کام چلا لیتا ہے۔ اسی چیز کا نام ہنڈی بھنانا ہے۔

ضرورت پڑ جانے پر کوئی مضائقہ نہیں اگر بینک اپنے دوسرے مصارف سے تھوڑا بہت اس غرض کے لئے استعمال کرلے۔ بہرحال، سوائے یہ بات بالکل واجبی بھی ہے کہ جو سود لے نہیں رہا ہے وہ سود دے کیوں؟ اور اجتماعی معیشت کے نقطۂ نظر سے یہ مفید بھی ہے کہ تاجروں کو اپنی روزمرہ کی ضروریات کے لئے بلا سود قرض ملتا رہے۔

رہا یہ سوال کہ اگر اس لین دین میں بینک کو سود نہ ملے تو وہ اپنے مصارف کیسے پورے کرے گا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ جب چالو کھاتوں (Current Account) کی ساری رقمیں بینک کے پاس بلا سود رہیں گی تو اس کے لئے انہی رقموں میں سے دستِ گرداں قرضے بلا سود دینا کوئی نقصان دہ معاملہ نہ رہے گا۔ کیونکہ اس صورت میں حساب کتاب اور دفترداری کے جو تھوڑے بہت مصارف بینک کو برداشت کرنے ہونگے اُن سے کچھ زیادہ ہی فوائد ان رقموں سے حاصل کرلیگا جو اس کے پاس جمع ہونگی۔ تاہم اگر بالفرض یہ طریقہ قابل عمل نہ ہو تو اس میں بھی کوئی مضائقہ نہیں کہ بینک اپنی اس طرح کی خدمات کیلئے ایک ماہوار یا ششماہی فیس اپنے تمام تجارت پیشہ کھاتہ داروں پر عائد کردے جو اس کے مصارف پورے کرنے کیلئے کافی ہو۔ سود کی بنسبت یہ فیس ان لوگوں کو بہت سستی پڑے گی اس لئے وہ بخوشی اسے گوارا کرلیں گے۔

حکومتوں کی غیر نفع آور ضروریات کیلئے تیسری اہم مد اُن قرضوں کی ہے جو حکومتوں کو کبھی وقتی حوادث کے لئے، اور کبھی غیر نفع آور ملکی ضروریات کے لئے اور کبھی جنگ کے لئے لینے ہوتے ہیں۔ موجودہ نظام مالیات میں ان سب مقاصد کے لئے روپیہ تمام تر قرض اور وہ بھی سودی قرض کی صورت میں حاصل ہوتا ہے۔ لیکن اسلامی نظام مالیات میں یہ عین ممکن ہوگا کہ ادھر حکومت کی طرف سے ضرورت کا اظہار ہو اور اُدھر قوم کے افراد اور ادارے خود لا لا کر چندوں کے ڈھیر اس کے سامنے لگا دیں اس لئے کہ سود کی بندش اور زکوٰۃ کی تنظیم لوگوں کو اس قدر آسودہ اور مطمئن کر دیگی کہ انہیں اپنے اندوختے (Savings) اپنی حکومت کو یونہی دے دینے میں کوئی تامل نہ ہوگا۔ اس پر بھی اگر بقدر ضرورت روپیہ نہ ملے تو حکومت قرض مانگے گی اور لوگ دل کھول کر اسے قرض حسن دینگے۔ لیکن اگر اس سے بھی ضروریات پوری نہ ہو سکیں، تو اسلامی حکومت اپنا کام چلانے

کے لئے حسب ذیل طریقے اختیار کر سکتی ہے :-

(۱) زکوٰۃ و خمس کی رقمیں استعمال کرے۔

(۲) تمام بینکوں سے ان کی رقوم امانت کا ایک مخصوص حصہ حکماً طلب کرلے جس کا اسے اتنا ہی حق پہنچتا ہے جتنا وہ افراد قوم سے لازمی فوجی خدمت (Conscription) طلب کرنے اور لوگوں سے ان کی عمارتیں اور موٹریں اور دوسری چیزیں بزور حاصل کرنے (Riequisition) حق رکھتی ہے۔

(۳) بدرجہ آخر وہ اپنی ضرورت کے مطابق نوٹ چھاپ کر بھی کام چلا سکتی ہے جو دراصل قوم ہی سے قرض لینے کی ایک دوسری صورت ہے۔

بین الاقوامی ضروریات کے لئے اب رہے بین الاقوامی قرضے تو اس معاملہ میں یہ تو بالکل ظاہر ہی ہے کہ موجودہ سود خوار دنیا میں ہم اپنی قومی ضرورت کے موقع پر کہیں سے ایک پیسہ بلا سود قرض پانے کی توقع نہیں کرسکتے۔ اس پہلو میں تو ہم کو تمام تر کوشش یہی کرنی ہوگی کہ ہم بیرونی قوموں سے کوئی قرض نہ لیں، کم از کم اُس وقت تک تو ہرگز نہ لیں جب تک کہ ہم خود دوسروں کو اس امر کا نمونہ نہ دکھا دیں کہ ایک قوم اپنے ہمسایوں کو کس طرح بلا سود قرض دے سکتی ہے۔ رہا قرض دینے کا معاملہ تو جو بحث اس سے پہلے ہم کرچکے ہیں، اس کے بعد شاید کسی صاحب نظر آدمی کو بھی یہ تسلیم کرنے میں تامل نہ ہوگا کہ اگر ایک دفعہ ہم نے ہمت کرکے اپنے ملک میں ایک صالح مالی نظام بندشِ سود اور تنظیم زکوٰۃ کی بنیاد پر قائم کرلیا تو یقیناً بہت جلدی ہماری مالی حالت اتنی اچھی ہوجائیگی کہ ہمیں نہ صرف خود باہر سے قرض لینے کی حاجت نہ ہوگی بلکہ ہم اپنے گرد و پیش کی حاجت مند قوموں کو بلا سود قرض دینے کے قابل ہوجائیں گے۔ اور جس روز ہم یہ نمونہ دنیا کے سامنے پیش کریں گے وہ دن دورِ جدید کی تاریخ میں صرف مالی اور معاشی حیثیت ہی سے نہیں بلکہ سیاسی اور تمدنی اور اخلاقی حیثیت سے بھی ایک انقلاب انگیز دن ہوگا۔ اُس وقت یہ امکان پیدا ہوجائیگا کہ ہمارا اور دوسری قوموں کا تمام لین دین غیر سودی بنیاد پر ہو۔ یہ بھی ممکن ہوگا کہ دُنیا کی قومیں یکے بعد دیگرے باہم ایسے معاہدات طے کرنے شروع کردیں کہ وہ ایک دوسرے سے سود نہیں لیں گی۔ اور بعید نہیں کہ وہ دن بھی ہم دیکھ سکیں جب بین الاقوامی واقعی عام سود خواری

کے خلاف بالاتفاق اُسی نفرت کا اظہار کرنے لگے جس کا اظہار ۱۹۴۵ء میں بریٹن ووڈس کے معاملہ پر انگلستان میں کیا گیا تھا۔ یہ محض ایک خیالی پلاؤ نہیں ہے، بلکہ فی الواقع آج بھی دُنیا کے سوچنے والے دماغ یہ سوچ رہے ہیں کہ بین الاقوامی قرضوں پر سود لگنے سے دنیا کی سیاست اور معیشت، دونوں پر نہایت بُرے اثرات مترتب ہوتے ہیں۔ اس طریقہ کو چھوڑ کر اگر خوشحال ممالک اپنی فاضل دولت کے ذریعہ سے خستہ حال اور آفت رسیدہ ممالک کو اپنے پاؤں پر کھڑے ہونے قابل بنانے کی مخلصانہ و ہمدردانہ کوشش کریں تو اس کا دوہرا فائدہ ہوگا۔ سیاسی و تمدنی حیثیت سے بین الاقوامی بدمزگی بڑھنے کے بجائے محبت اور دوستی بڑھیگی۔ اور معاشی حیثیت سے ایک خستہ حال دیوالیہ ملک خون چوسنے کی بہ نسبت ایک خوشحال اور مالدار ملک کے ساتھ کاروبار کرنا بدرجہا زیادہ نافع ثابت ہوگا۔ یہ عافیت کی باتیں سوچنے والے سوچ رہے ہیں اور کہنے والے کہہ رہے ہیں، لیکن ساری کسر بس اس بات کی ہے کہ دنیا میں کوئی حکیم قوم ایسی نہیں ہے جو پہلے اپنے گھر سے سودخواری کو نکالے اور پھر آگے بڑھ کر بین الاقوامی لین دین سے اس لعنت کو خارج کرنے کی عملاً ابتدا کر دے۔

<u>نفع آور اغراض کیلئے سرمایہ کی بہم رسانی</u> مالیاتِ قرض کے بعد اب ایک نظر یہ بھی دیکھ لیجیے کہ ہمارے پیش نظر نظام میں کاروباری مالیات کیا شکل اختیار کریں گے۔ اس سلسلہ میں جیسا کہ ہم پہلے اشارہ کر چکے ہیں، سود کا انسداد لوگوں کے لئے یہ دروازہ تو قطعی بند کر دے گا کہ وہ محنت اور خطرہ (Risk) دونوں چیزوں سے بچ کر اپنے سرمائے کو تحفظ اور متعین منافع کی ضمانت کے ساتھ کسی کام میں لگا سکیں۔ اور اسی طرح زکوٰۃ ان کے لئے اس دروازے کو بھی بند کر دے گی کہ وہ اپنا سرمایہ روک رکھیں اور اس پر مارِ زرین کر بیٹھ جائیں۔ مزید براں ایک حقیقی اسلامی حکومت کی موجودگی میں لوگوں کے لئے عیاشیوں اور فضول خرچیوں کا دروازہ بھی کھلا نہ رہیگا کہ اُن کی فاضل آمدنیاں اِدھر بہ نکلیں۔ اِس کے بعد لامحالہ اُن تمام لوگوں کو جو ضرورت سے زائد آمدنی رکھتے ہوں دو راستوں میں سے کوئی ایک راستہ ہی اختیار کرنا پڑیگا:

اگر وہ مزید آمدنی کے طالب نہ ہوں تو اپنی بچت کو رفاہِ عام کے کاموں میں صرف کریں، خواہ

اس کی صورت یہ ہو کہ وہ خود کسی کار خیر پر اسے وقف کریں، یا یہ ہو کہ قومی اداروں کو چندے اور عطیے دیں، یا پھر یہ ہو کہ بے غرضانہ ومخلصانہ طریقہ سے اسلامی حکومت کے حوالہ کردیں تاکہ وہ اسے امور نافعہ اور ترقیات عامہ اور اصلاح خلق کے کاموں پر صرف کرے۔ خصوصیت کے ساتھ آخری صورت کو زیادہ ترجیح دی جائیگی۔ جبکہ حکومت کا نظم ونسق ایسے کارکنوں کے ہاتھوں میں ہو جن کی دیانت اور فراست پر عموماً لوگوں کو بھروسہ ہو۔ اس طرح اجتماعی مصالح اور ترقی وبہبود کے کاموں کے لئے حکومت کو اور دوسرے اجتماعی اداروں کو سرمائے کی ایک کثیر مقدار ہمیشہ مفت ملتی رہے گی جس کا سود یا منافع تو درکنار اصل ادا کرنے کے لئے بھی عوام الناس پر ٹیکس کا کوئی بار نہ پڑے گا

اور اگر وہ مزید آمدنی کے خواہشمند ہوں تو ان کے لیے اس چیز کے حصول کا صرف ایک راستہ کھلا ہوگا یعنی یہ کہ اپنی بچائی ہوئی رقموں کو مضاربت (یعنی نفع اور نقصان میں متناسب شرکت) کے اصول پر نفع بخش کاموں میں لگائیں، خواہ براہ راست خود، یا حکومت کی توسط سے، یا بینکوں کے توسط سے۔

خود لگانا چاہینگے تو ان کو کسی کاروبار میں شرکت کی شرائط آپ طے کرنی ہونگی جن میں ازروئے قانون اس امر کا تعین ضروری ہوگا کہ فریقین کے درمیان نفع اور نقصان کی تقسیم کس تناسب سے ہوگی۔

علی ہذا القیاس مشترک سرمائے کی کمپنیوں میں بھی شرکت کی صورت صرف یہی ایک ہوگی کہ سیدھے سادے حصے خرید لئے جائیں۔ بانڈ اور ڈبنچر اور اسی طرح کی دوسری چیزیں، جن کے خریدار کو کمپنی سے ایک لگی بندھی آمدنی ملتی ہے، سرے سے موجود ہی نہ ہوں گی۔

حکومت کے توسط سے لگانا چاہیں گے تو انہیں امور نافعہ سے متعلق حکومت کی کسی اسکیم میں حصہ دار بننا ہوگا۔ مثال کے طور پر فرض کیجئے کہ حکومت برق آبی کی کوئی تجویز عمل میں لانا چاہتی ہے وہ اس کا اعلان کرکے پبلک کو اس میں شرکت کی دعوت دیگی۔ جو اشخاص یا ادارے یا بینک اس میں سرمایہ دیں گے وہ حکومت کے ساتھ اس میں حصہ دار بن جائینگے اور اس کے کاروباری منافع میں سے ایک طے شدہ تناسب کے مطابق حصہ پاتے رہینگے۔ نقصان ہوگا تو اس کا بھی متناسب حصہ ان سب پر اور حکومت پر تقسیم ہوجائیگا۔ اور حکومت اس امر کی بھی حق دار ہوگی کہ ایک ترتیب کے ساتھ بتدریج لوگوں کے

حصے خود خریدتی چلی جائے یہاں تک کہ چالیس پچاس سال میں برق آبی کا وہ پورا کام خالص سرکاری ملک بن جائے۔

مگر موجودہ نظام میں بھی سب سے زیادہ قابل عمل اور مفید تیسری صورت ہی ہوگی یعنی یہ کہ لوگ بینکوں کے توسط سے اپنا سرمایہ نفع بخش کاموں میں لگائیں اسلئے ہم اس کو ذرا زیادہ وضاحت کے ساتھ بیان کرنا چاہتے ہیں تاکہ لوگوں کے سامنے اس امر کی صاف تصویر آجائے کہ سود کو ساقط کرنے کے بعد بینکنگ کا کاروبار کس طرح چل سکتا ہے اور نفع کے طالب لوگ اس سے کس طرح متمتع ہو سکتے ہیں۔

بینکنگ کی اسلامی صورت بینکنگ کے متعلق اس سے پہلے ہم نے جو بحث کی ہے اس کا یہ مطلب نہ تھا اور نہ ہو سکتا ہے کہ یہ کام سرے سے ہی غلط اور ناجائز ہے۔ دراصل بینکنگ بھی موجودہ تہذیب کی پرورش کی ہوئی بہت سی چیزوں کی طرح ایک ایسی اہم اور مفید چیز ہے جس کو صرف ایک شیطانی عنصر کی شمولیت نے گندہ کر رکھا ہے اول تو وہ بہت سی ایسی جائز خدمات انجام دیتا ہے۔ جو موجودہ زمانے کی تمدنی زندگی اور کاروباری ضروریات کے لئے مفید بھی ہیں اور ناگزیر بھی۔ مثلاً رقموں کا ایک جگہ سے دوسری جگہ بھیجنا اور ادائیگی کا انتظام کرنا، بیرونی ممالک سے لین دین کی سہولتیں بہم پہنچانا، قیمتی اشیاء کی حفاظت کرنا، اعتماد نامے (Letters of Credit) سفری چک اور گشتی نوٹ جاری کرنا، کمپنیوں کے حصوں کی فروخت کا انتظام کرنا۔ اور بہت سی وکیلانہ خدمات (Agency services) جنہیں تھوڑے سے کمیشن پر بینک کے سپرد کر کے آج ایک مصروف آدمی بہت سے جھنجھٹوں سے خلاصی پالیتا ہے۔ یہ وہ کام ہیں جنہیں بہرحال جاری رہنا چاہیئے۔ اور ان کیلئے ایک مستقل ادارے کا ہونا ضروری ہے۔ پھر یہ بات بھی بجائے خود تجارت، صنعت، زراعت اور ہر شعبۂ تمدن و معیشت کے لئے نہایت مفید اور آج کے حالات کے لحاظ سے نہایت ضروری ہے کہ معاشرے کا فاضل سرمایہ بکھرا ہوا رہنے کے بجائے ایک مرکزی ذخیرے (Reservoir) میں مجتمع ہو اور وہاں سے وہ زندگی کے ہر شعبہ کو آسانی کے ساتھ ہر وقت ہر جگہ بہم پہنچ سکے۔ اور اس کے ساتھ عام افراد کے لئے

بھی اس میں بڑھتی ہے۔ الگ الگ بطورِ خود ڈھونڈتے پھرنے کے بجائے سب اس کو ایک مرکزی ذخیرے میں جمع کرا دیا کریں اور وہاں ایک قابلِ اطمینان طریقے سے اجتماعی طور پر ان سب کے سرمائے کو کام پر لگانے اور حاصل شدہ منافع کو ان پر تقسیم کرنے کا انتظام ہوتا رہے۔ ان سب پر مزید یہ کہ مستقل طور پر مالیات (Finance) ہی کا کام کرتے رہنے کی وجہ سے بنک کے منتظمین اور کارکنوں کو اس فنی شعبے میں ایک ایسی مہارت اور بصیرت حاصل ہو جاتی ہے جو تاجروں، صناعوں اور دوسرے معاشی کارکنوں کو نصیب نہیں ہوتی۔ یہ ماہرانہ بصیرت بجائے خود ایک نہایت قیمتی چیز ہے اور بڑی مفید ثابت ہو سکتی ہے بشرطیکہ یہ محض ساہوکار کی خود غرضی کا ہتھیار بن کر نہ رہے بلکہ کاروباری لوگوں کے ساتھ تعاون میں استعمال ہو۔ لیکن بینکنگ کی ان ساری خوبیوں اور منفعتوں کو جس چیز نے الٹ کر پورے تمدن کے لیے برائیوں اور مضرتوں سے بدل دیا ہے وہ سود ہے، اور اس کے ساتھ دوسری بنائے فاسد یہ بھی شامل ہو گئی ہے کہ ہے سود کی کشش سے جو سرمایہ کھنچ کھنچ کر بینکوں میں مرتکز ہوتا ہے وہ عملاً چند خود غرض سرمایہ داروں کی دولت بن کر رہ جاتا ہے جسے وہ نہایت دشمنِ اجتماع طریقوں سے استعمال کرتے ہیں۔ ان دو خرابیوں کو اگر دور کر دیا جائے تو بینکنگ ایک پاکیزہ کام بھی ہو جائیگا، تمدن کے لئے بھی موجودہ حالت کی بہ نسبت بدرجہا زیادہ نافع ہوگا، اور عجب نہیں کہ خود ساہوکاروں کے لئے بھی سود خواری کی بہ نسبت یہ دوسرا پاکیزہ طریق کار مالی حیثیت سے زیادہ فائدہ مند ثابت ہوگا۔

جو لوگ یہ گمان کرتے ہیں کہ انسدادِ سود کے بعد بینکوں میں سرمایہ اکٹھا ہونا ہی بند ہو جائیگا۔ وہ غلطی پر ہیں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ جب سود ملنے کی توقع ہی نہ ہوگی تو لوگ کیوں اپنی فاضل آمدنیاں بینک میں رکھوائینگے۔ حالانکہ اُس وقت سود کی نہ سہی نفع ملنے کی توقع تو ضرور ہوگی، اور چونکہ نفع کا امکان غیر متعین اور غیر محدود ہوگا اس لئے عام شرحِ سود کی بہ نسبت کم نفع حاصل ہونے کا جس قدر امکان ہوگا اُسی قدر زیادہ اچھا خاصا زیادہ نفع ملنے کا امکان بھی ہوگا۔ اس کے ساتھ بینک وہ تمام خدمات بدستور انجام دیتے رہیں گے جن کی خاطر اب لوگ بینکوں کی طرف رجوع کیا کرتے ہیں۔ لہٰذا یہ بالکل ایک یقینی بات ہے کہ جس مقدار میں اب سرمایہ بینکوں کے پاس آتا ہے اسی مقدار میں انسدادِ سود کے بعد بھی آتا رہیگا، بلکہ اُس

* جو بہت سے لوگ جو تھوڑا یا بہت سرمایہ ان کی ضرورت سے بچ رہتا ہے اسے وہ کسی نفع بخش کام میں لگانے کے مواقع *

وقت چونکہ ہر طرح کے کاروبار کو زیادہ فروغ حاصل ہوگا، روزگار بڑھ جائے گا، اور آمدنیاں بھی بڑھ جائیں گی، اس لئے موجودہ حالت کی بہ نسبت کہیں بڑھ چڑھ کر فاضل آمدنیاں بینکوں میں جمع ہوں گی۔ اس جمع شدہ سرمایہ کا جس قدر حصہ چالو کھاتے یا عند الطلب کھاتے میں ہوگا اس کو تو بینک کسی نفع بخش کام میں نہ لگا سکیں گے، جس طرح اب بھی نہیں لگا سکتے ہیں۔ اس لئے وہ زیادہ تر دو بڑے کاموں میں استعمال ہوگا۔ ایک روزمرہ کا انفصال دین۔ دوسرے کاروباری لوگوں کو قلیل المدت قرضے بلا سود دینا اور ہنڈیاں بلا سود بھنانا۔ رہا وہ سرمایہ جو لمبی مدت کے لیے بینکوں میں رکھا جائیگا تو اسے وہ سودی قرض پر چلانے کے بجائے بڑی اچھی طرح مضاربت کے اصول پر تجارتی کاروبار میں، صنعتی اسکیموں میں، زراعتی کاموں میں، اور پبلک اداروں اور حکومتوں کے نفع آور کاموں میں لگا سکیں گے۔ اور اس سے بحیثیت مجموعی دو عظیم الشان فائدے ہوں گے۔ ایک یہ کہ ساہوکار کا مفاد کاروبار کے مفاد کے ساتھ متحد ہو جائیگا اس لئے کاروبار کی ضرورت کے مطابق سرمایہ اس کی پشتیبانی کرتا رہیگا اور وہ اسباب قریب قریب ختم ہو جائینگے جن کی بنا پر موجودہ سود خوار دنیا میں کساد بازاری کے دورے پڑا کرتے ہیں۔ دوسرے یہ کہ ساہوکار کی مالیاتی بصیرت اور کاروباری لوگوں کی تجارتی و صنعتی بصیرت جو آج باہم نبرد آزمائی کرتی رہتی ہیں اُس وقت ایک دوسرے کے ساتھ دستیاری اور تعاون کریں گی اور یہ سب ہی کے لئے مفید ہوگا۔ پھر جو منافع اِن ذرائع سے بینکوں کو حاصل ہوں گے اُن کو وہ اپنے انتظامی مصارف نکالنے کے بعد ایک مقرر تناسب کے مطابق اپنے حصہ داروں اور کھاتہ داروں میں تقسیم کر دیں گے۔ اس معاملہ میں فرق صرف یہ ہوگا کہ بجائے موجودہ منافع (Dividends) جو حصہ داروں میں تقسیم ہوتے ہیں اور کھاتہ داروں کو سود دے دیا جاتا ہے۔ اُس وقت دونوں میں منافع ہی تقسیم ہونگے۔ اب کھاتہ داروں کو ایک متعین شرح کے مطابق سود ملا کرتا ہے۔ اس وقت شرح کا تعین نہ ہوگا بلکہ جتنے بھی منافع ہوں گے، خواہ کم ہوں یا زیادہ، وہ سب ایک تناسب کے ساتھ تقسیم ہو جائینگے۔ نقصان اور دیوالیہ کا جتنا خطرہ اب ہے اُتنا ہی اس وقت بھی ہوگا۔ اب خطرہ اور اس کے بالمقابل غیر محدود نفع کا امکان، دونوں صرف بینک کے حصہ داروں کے لئے مخصوص ہیں۔ اُس وقت یہ

دونوں چیزیں کھاتہ داروں اور حصہ داروں میں مشترک ہو جائیں گی۔

رہ گیا بینکنگ کا یہ نقصان کہ نفع کی کشش سے جو سرمایہ اُن کے پاس اکٹھا ہوتا ہے اس کی مجتمع طاقت پر عملاً صرف چند ساہوکار قابض و متصرف ہوتے ہیں تو اس کے تدارک کے لئے ہم کو یہ کرنا ہوگا کہ مرکزی ساہوکاری (Central Banking) کا سارا کام بیت المال یا اسٹیٹ بینک خود اپنے ہاتھ میں رکھے اور قوانین کے ذریعہ سے تمام پرائیویٹ بینکوں پر حکومت کا اقتدار اور دخل وضبط اس حد تک قائم کر دیا جائے کہ ساہوکار اپنی مالیات طاقت کا بیجا استعمال نہ کر سکیں۔

غیر سودی مالیات کا یہ مجمل نقشہ جو ہم نے پیش کیا ہے کیا اسے دیکھنے کے بعد بھی اس شبہ کی کوئی گنجائش رہ جاتی ہے کہ سود کا انسداد قابل عمل نہیں ہے؟

سود کے مباحث میں ایک ترمیم

ربا الفضل کی حقیقت اور اس کے احکام

اپنی تالیف "سود" میں جناب مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی نے "سود کے متعلقات" کے زیر عنوان ربا الفضل کے متعلق جو بحث سپرد قلم فرمائی تھی، اس پر موصوف نے نظر بندی کے زمانے میں دوبارہ نگاہ ڈالی تو اس میں ترمیم کرنا ضروری معلوم ہوا۔ دراصل مولانا موصوف ملتان جیل میں احادیث کا تحقیقی مطالعہ فرما رہے تھے، اس مطالعہ کے دوران میں ربا الفضل کے بارے میں ان کے سامنے کچھ ایسی تصریحات آئیں کہ مولانا کو اپنی سابق رائے سے رجوع کرنا پڑا۔ چنانچہ اس موضوع پر جو بحث "سود" میں درج تھی اسے (صفحہ ۱۳۷ تا صفحہ ۱۵۰) آپ نے بالکل بدل دیا ہے۔ چنانچہ مذکورہ بالا باب کو ترمیم شدہ شکل میں دوبارہ شائع کیا جا رہا ہے۔ (ادارہ)

ہم پہلے بیان کر چکے ہیں کہ ربوٰ دراصل اس زیادتی کو کہتے ہیں جو راس المال سے فائدہ اٹھانے کے لئے مہلت دے کر محض وقت کے معاوضہ میں وصول کی جاتی ہے۔ اصطلاح شرع میں اس کو "ربا النسیئہ" کہا جاتا ہے یعنی وہ ربوٰ جو قرض کے معاملہ میں لیا اور دیا جاتا ہے۔ قرآن مجید میں اسی کو حرام کیا گیا ہے۔ اس کی حرمت پر تمام امت کا اتفاق ہے اور اس میں کبھی کسی شک و شبہ نے راہ نہیں پائی ہے۔

لیکن شریعت اسلامی کے قواعد میں سے ایک قاعدہ یہ بھی ہے کہ جس چیز کو حرام کیا جاتا ہے، اس کی طرف جانے کے جتنے راستے ممکن ہیں ان سب کو بند کر دیا جاتا ہے، بلکہ اس کی طرف پیش قدمی کی ابتدا جس مقام سے ہوتی ہے وہیں روک لگا دی جاتی ہے تاکہ انسان اس کے قریب بھی نہ جانے پائے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس قاعدے کو ایک لطیف مثال میں بیان فرمایا ہے۔ عرب کی اصطلاح میں حمیٰ اس چراگاہ کو کہتے ہیں جو کسی شخص نے اپنے جانوروں کے لئے مخصوص کر لی ہو اور جس میں دوسروں کے لئے اپنے جانور چرانا ممنوع ہو۔ حضور فرماتے ہیں کہ ہر بادشاہ کی ایک حمیٰ ہوتی ہے اور اللہ تعالیٰ کی حمیٰ اس کے وہ حدود ہیں جن سے باہر

قدم نکالنے کو اس نے حرام قرار دیا ہے۔ جو جانور حمیٰ کے اردگرد چرتا پھرتا ہے، بعید نہیں کہ کسی وقت چرتے چرتے وہ حمیٰ کے حدود میں بھی داخل ہو جائے۔ اسی طرح جو شخص اللہ تعالیٰ کی حمیٰ یعنی ان حدود کے اطراف میں چکر لگاتا رہتا ہے اس کے لیے ہر وقت یہ خطرہ ہے کہ کب اس کا پاؤں پھسل جائے اور وہ حرام میں مبتلا ہو جائے۔ لہٰذا جو امور حلال و حرام کے درمیان واسطہ ہیں ان سے بھی پرہیز لازم ہے تاکہ تمہارا دین محفوظ رہے۔"

یہی مصلحت ہے جس کو مدنظر رکھ کر شارع حکیم نے ہر ممنوع چیز کے اطراف میں حرمت اور کراہیت کی ایک مضبوط باڑھ لگا دی ہے، اور ان کا پیمانہ ممنوعات کے ذرائع رہنے اور ان کے قرب و بُعد کے لحاظ سے سخت یا نرم پابندیاں عاید کردی ہیں۔

سود کے مسئلہ میں بھی ابتدائی حکم صرف یہ تھا کہ قرض کے معاملات میں جو سودی لین دین ہوتا ہے وہ قطعاً حرام ہے۔ چنانچہ اسامہ بن زید سے جو حدیث مروی ہے اس میں حضورؐ کا یہ ارشاد نقل کیا گیا ہے کہ انما الربا فی النسیئۃ (وفی بعض الالفاظ لاربا الا فی النسیئۃ) یعنی سود صرف قرض کے معاملات میں(۱) ہے۔ لیکن بعد میں آنحضرت علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اللہ تعالیٰ کی اس حمیٰ کے اردگرد بندشیں لگانا ضروری سمجھا، تاکہ لوگ اس کے قریب بھی نہ پھٹک سکیں۔ اسی قبیل سے وہ فرمان نبوی ہے جس میں سود کھانے اور کھلانے کے ساتھ سود کی دستاویز لکھنے اور اس پر گواہی دینے کو بھی حرام کیا گیا ہے۔ اور اسی قبیل سے وہ احادیث ہیں جن میں ربٰوا الفضل کی تحریم کا حکم دیا گیا ہے۔

ربٰوا الفضل کا مفہوم: ربٰوا الفضل اس زیادتی کو کہتے ہیں جو ایک ہی جنس کی دو چیزوں کے دست بدست لین دین میں ہو۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو حرام قرار دیا، کیونکہ اس سے زیادہ ستانی کا دروازہ کھلتا ہے

---

(۱) حضرت عبداللہ بن عباس نے ابتداءً اسی حدیث کی بنا پر فتویٰ دیا تھا کہ سود صرف قرض کے معاملات میں ہے نقد میں نہیں ہے۔ لیکن جب بعد میں ان کو متواتر روایات سے معلوم ہوا کہ حضورؐ نے نقد معاملات میں بھی تفاضل کو منع فرمایا ہے تو انھوں نے اپنے پہلے قول سے رجوع کر لیا۔ چنانچہ حضرت جابر کی روایت ہے کہ رجع ابن عباس عن قولہ فی الصرف وعن قولہ فی المتعۃ۔ اسی طرح حاکم نے حیان العدوی کے طریق سے روایت کیا ہے کہ حضرت ابن عباس نے بعد میں اپنے سابق فتوے پر توبہ و استغفار کی اور نہایت سختی کے ساتھ ربوا الفضل سے منع کرنے لگے۔

اور انسان میں وہ ذہنیت پرورش پاتی ہے جس کا آخری ثمرہ سود خواری ہے۔ چنانچہ حضورؐ نے خود ہی اس مصلحت کو اس حدیث میں بیان فرما دیا ہے جس کو ابو سعید خدری نے بدیں الفاظ نقل کیا ہے۔ کہ لا تبیعوا الدرھم بدرھمین فانی اخاف علیکم الرماء والرماء ھو الربا۔ یعنی ایک درہم کو دو درہموں کے عوض فروخت کرو کیونکہ مجھے خوف ہے کہ کہیں تم سود خواری میں نہ مبتلا ہو جاؤ۔

ربا الفضل کے احکام: سود کی اس قسم کے متعلق نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے جو احکام منقول ہیں ان کو یہاں لفظ بلفظ نقل کیا جاتا ہے۔

عن عبادۃؓ بن الصامت قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم الذھب بالذھب والفضۃ بالفضۃ والبرّ بالبرّ والشعیر بالشعیر والتمر بالتمر والملح بالملح مثلاً بمثلٍ سواءً بسواءٍ یداً بیدٍ فاذا اختلفت ھذہ الاصناف فبیعوا کیف شئتم اذا کان یداً بیدٍ (احمد ومسلم والنسائی وابن ماجہ وابی داؤد نحوہ وفی آخرہ) وامرنا ان نبیع البرّ بالشعیر والشعیر بالبرّ یداً بیدٍ کیف شئنا

عبادہ بن صامت سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا سونے کا مبادلہ سونے سے اور چاندی کا چاندی سے اور گیہوں کا گیہوں سے اور جَو کا جَو سے اور کھجور کا کھجور سے اور نمک کا نمک سے اس طرح ہونا چاہیے کہ جیسے کا تیسا اور برابر سرابر اور دست بدست ہو۔ البتہ اگر مختلف اصناف کی چیزوں کا ایک دوسرے سے مبادلہ ہو تو پھر جس طرح چاہو بیچو بشرطیکہ لین دین دست بدست ہو جائے۔ (مسند احمد و صحیح مسلم۔ یہی حدیث نسائی اور ابن ماجہ اور ابوداؤد میں بھی آئی ہے، اور اس کے آخر میں اتنا اضافہ اور ہے۔) اور آپ نے ہمیں حکم دیا کہ ہم گیہوں کا مبادلہ جَو سے اور جَو کا گیہوں سے دست بدست جس طرح چاہیں کریں۔

عن ابی سعید الخدریؓ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم الذھب بالذھب والفضۃ بالفضۃ والبرّ بالبرّ والشعیر بالشعیر والتمر بالتمر والملح بالملح مثلاً بمثلٍ یداً بیدٍ فمن زاد او

ابو سعید خدری کہتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا سونے کا مبادلہ سونے سے، چاندی کا چاندی سے، گیہوں کا گیہوں سے، جَو کا جَو سے، کھجور کا کھجور سے، نمک کا نمک سے جیسے کا تیسا اور دست بدست ہونا

استزاد فقد اربى الآخذ والمعطى فيه سواء (البخاري واحمد ومسلم واللفظ) لا تبيعوا الذهب بالذهب ولا الورق بالورق الا وزنا بوزن مثلا بمثل سواء بسواء (احمد ومسلم)

چاہیے جس نے زیادہ دیا یا زیادہ لیا اس نے سودی معاملہ کیا لینے والا اور دینے والا دونوں گناہ میں برابر ہیں (بخاری، احمد، مسلم)۔ اور ایک دوسری روایت میں ہے، سونے کو سونے کے عوض اور چاندی کو چاندی کے عوض فروخت نہ کرو مگر وزن میں مساوی ہوں کا توں اور برابر سرابر (احمد و مسلم)

وعنه قال قال رسول الله صلى الله عليه وسلم لا تبيعوا الذهب بالذهب الا مثلا بمثل ولا تشفوا بعضها على بعض ولا تبيعوا الورق بالورق الا مثلا بمثل ولا تشفوا بعضها على بعض ولا تبيعوا منها غائبا بناجز (البخاري ومسلم)

ابو سعید خدری کہتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا سونے کو سونے کے عوض نہ بیچو مگر جوں کا توں۔ کوئی کسی کو زیادہ نہ دے۔ اور چاندی کو چاندی کے عوض نہ بیچو مگر جوں کا توں کوئی کسی کو زیادہ نہ دے۔ اور نہ غائب کا تبادلہ حاضر سے کرو۔ (بخاری و مسلم)

عن ابي هريرة عن النبي صلى الله عليه وسلم قال التمر بالتمر والحنطة بالحنطة والشعير بالشعير والملح بالملح مثلا بمثل يدا بيد فمن زاد او استزاد فقد اربى الا ما اختلفت الوانه (مسلم)

ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کھجوروں کا مبادلہ کھجور سے، گیہوں کا گیہوں سے جو کا جو سے اور نمک کا نمک سے جوں کا توں اور دست بدست ہونا چاہیے جس نے زیادہ دیا یا زیادہ لیا اس نے سودی معاملہ کیا، سوائے اس صورت کے جبکہ ان اشیا کے رنگ مختلف ہوں

عن سعد بن ابي وقاص قال سمعت رسول الله صلى الله عليه وسلم سئل عن شراء التمر بالرطب فقال اينقص الرطب اذا يبس قال نعم فنهاه عن ذلك (مالك والترمذي و

سعد بن ابی وقاص کہتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا گیا اور میں سن رہا تھا کہ خشک کھجور کا تر کھجور کے ساتھ مبادلہ کس طریقہ پر کیا جائے۔ آپ نے دریافت فرمایا کیا تر کھجور سوکھنے کے بعد کم ہو جاتی ہے؟ سائل نے عرض کیا

ابو داؤد والنسائی وابن ماجه)

ہاں تب آپ نے سرے سے اس مبادلے کو منع فرمادیا

(مالک ترمذی ۔ ابوداؤد ۔ نسائی ۔ ابن ماجہ)

عن ابی سعید قال کنا نرزق تمر الجمع و هو الخلط من التمر وکنا نبیع صاعین بصاع فقال النبی صلی الله علیه وسلم لا صاعین بصاع ولا درهمین بدرهم (البخاری)

ابوسعید خدری کہتے ہیں کہ ہم لوگوں کو بالعموم اجرتوں اور تنخواہوں میں مخلوط قسم کی کھجوریں ملا کرتی تھیں اور ہم دو صاع مخلوط کھجوریں دے کر ایک صاع اچھی قسم کی کھجوریں لے لیا کرتے تھے ۔ پھر نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ نہ دو صاع کا مبادلہ ایک صاع سے کرو اور نہ دو درہم کا ایک درہم سے

عن ابی سعید وابی هریرة ان رسول الله صلی الله علیه وسلم استعمل رجلا علی خیبر فجاءه بتمر جنیب فقال اکل تمر خیبر هکذا؟ قال لا والله یا رسول الله انا لنأخذ الصاع من هذا بالصاعین والصاعین بالثلاث فقال لا تفعل بع الجمع بالدراهم ثم ابتع بالدراهم جنیبا وقال فی المیزان مثل ذالك (البخاری ومسلم)

ابوسعید خدریؓ اور ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک شخص کو خیبر کا تحصیلدار مقرر کر کے بھیجا ۔ وہ وہاں سے مالگزاری میں عمدہ قسم کی کھجوریں لے کر آیا ۔ آں حضرت نے پوچھا کیا خیبر کی ساری کھجوریں ایسی ہی ہوتی ہیں؟ اس نے کہا نہیں یا رسول اللہ ہم جو ملی جلی کھجوریں وصول کرتے ہیں انہیں کبھی ۲ صاع کے بدلے ایک صاع کے حساب سے ۔ کبھی ۳ صاع کے بدلے ۲ صاع کے حساب سے ان اچھی کھجوروں سے بدل لیتے ہیں ۔ اس پر آپ نے فرمایا ایسا نہ کیا کرو پہلے ان مخلوط کھجوروں کو درہموں کے عوض فروخت کردو پھر اچھی قسم کی کھجوریں درہموں کے عوض خرید لو یہی بات آپ نے وزن کے حساب سے مبادلہ کرنے کی صورت میں بھی ارشاد فرمائی (بخاری و مسلم)

عن ابی سعید قال جاء بلال الی النبی

ابوسعید خدری کہتے ہیں کہ ایک دفعہ بلال نبی صلی اللہ

صلی اللہ علیہ وسلم بتمر برنی فقال له
النبی صلی اللہ علیہ وسلم من این هذا
قال کان عندنا تمر ردیّ فبعت منه
صاعین بصاع فقال أوّه عین الربا عین الربا
لا تفعل ولکن اذا اردت ان تشتری
فبع التمر ببیع آخر ثم اشتریه
(البخاری ومسلم)

عن فضالة بن عبید قال اشتریت
قلادة یوم خیبر باثنی عشر دینارا فیها
ذهب وخرز ففصلتها فوجدت فیها
اکثر من اثنی عشر دینارا فذکرت
ذالک للنبی صلی اللہ علیہ وسلم فقال
لا یباع حتی یفصل (مسلم، نسائی، ابو
داؤد، ترمذی)

عن ابی بکرة قال نهی النبی صلی
اللہ علیہ وسلم عن الفضة بالفضة
والذهب بالذهب الا سواء بسواء
وامرنا ان نشتری الفضة کیف شئنا
(البخاری ومسلم)

علیہ وسلم کی خدمت میں برنی کھجوریں لے کر آئے (جو کھجور کی ایک بہترین قسم ہوتی ہے)۔ آپ نے پوچھا یہ کہاں سے لے آئے؟ انھوں نے عرض کیا ہمارے پاس گھٹیا قسم کی کھجور تھی میں نے وہ دو صاع دے کر یہ ایک صاع خرید لی فرمایا ہائیں! قطعی سود! قطعی سود! ایسا ہرگز نہ کیا کرو جب تمہیں اچھی کھجوریں خریدنی ہوں تو اپنی کھجوریں درہم یا کسی اور چیز کے عوض بیچ دو پھر اس قیمت سے اچھی کھجوریں خرید لو

فضالہ بن عبید کہتے ہیں کہ میں نے جنگ خیبر کے موقع پر ایک سونے کا جڑاؤ ہار ۱۲ دینار میں خریدا پھر جو میں نے اس ہار کو توڑ کر نگ اور سونا الگ الگ کیا تو اس کے اندر ۱۲ دینار سے زیادہ کا سونا نکلا۔ میں نے اسکا ذکر نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے کیا۔ آپ نے فرمایا آئندہ سے کوئی کا جڑاؤ زیور سونے کے عوض نہ بیچا جائے جب تک کہ نگ سونے کو الگ الگ نہ کر دیا جائے (مسلم، نسائی، ابو داؤد، ترمذی)

ابوبکرہ کہتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا کہ چاندی کو چاندی سے اور سونے کو سونے سے مبادلہ نہ کیا جائے مگر برابری کے ساتھ۔ نیز آپ نے فرمایا کہ چاندی کو سونے سے اور سونے کو چاندی سے جس طرح چاہو بدل سکتے ہو (بخاری ومسلم)

؎ یہ خیال رہے کہ اس زمانے میں درہم و دینار خالص چاندی اور سونے کے ہوتے تھے۔ اور ان کی قیمت ان کی چاندی اور سونے کے وزن کے لحاظ سے ہوتی تھی۔ لہٰذا اس زمانے میں دینار کے عوض سونا اور درہم کے عوض چاندی خریدنا بالکل یہی معنی رکھتا تھا کہ آدمی نے سونے کے عوض سونا خریدا اور چاندی کے عوض چاندی حاصل کی۔

احکام بالا کا ماحصل: (۱) یہ ظاہر ہے کہ ایک ہی جنس کی دو چیزوں کو بدلنے کی ضرورت صرف انہی صورتوں میں پیش آتی ہے جب کہ اتحادِ جنس کے باوجود ان کی نوعیتیں مختلف ہوں مثلاً چاول، اور گیہوں کی ایک قسم اور دوسری قسم، عمدہ سونا اور گھٹیا سونا، یا معدنی نمک اور سمندری نمک وغیرہ۔ ان مختلف اقسام کی ہم جنس چیزوں کو ایک دوسرے کے ساتھ بدلنا، اگرچہ بازار کے نرخ ہی کو ملحوظ رکھ کر ہو، بہر حال ان میں کمی بیشی کے ساتھ مبادلہ کرنے سے اس ذہنیت کے پرورش پانے کا اندیشہ ہے جو بالآخر سود خواری اور ناجائز نفع اندوزی تک جا پہنچتی ہے اس لیے شریعت نے قاعدہ مقرر کر دیا کہ ہم جنس اشیاء کے مبادلہ کی اگر ضرورت پیش آئے تو لازماً حسب ذیل دو شکلوں میں سے ہی کوئی ایک شکل اختیار کرنی ہوگی۔ ایک یہ کہ ان کے درمیان قدر و قیمت کا جو تھوڑا سا فرق ہو اُسے نظر انداز کر کے برابر سرابر مبادلہ کر لیا جائے۔ دوسرے یہ کہ چیز کا چیز سے براہِ راست مبادلہ کرنے کے بجائے ایک شخص اپنی چیز روپے کے عوض بازار کے بھاؤ بیچ دے اور دوسرے شخص سے اس کی چیز روپے کے عوض بازار کے بھاؤ خرید لے۔

(۲) جیسا کہ ابھی ہم بیان کر چکے ہیں۔ قدیم زمانے میں تمام سکّے خالص چاندی سونے کے ہوتے تھے اور ان کی قیمت دراصل ان کی چاندی اور ان کے سونے کی قیمت ہوتی تھی اُس زمانے میں درہم کو درہم سے اور دینار کو دینار سے بدلنے کی ضرورت ایسے مواقع پر پیش آتی تھی جبکہ مثلاً کسی شخص کو عراقی درہم کے عوض رومی درہم درکار ہوتے یا رومی دینار کے بدلے ایرانی دینار کی حاجت ہوتی۔ ایسی ضرورتوں کے موقع پر یہودی ساہوکار اور دوسرے ناجائز نفع کمانے والے لوگ کچھ اسی طرح کا ناجائز منافع وصول کرتے تھے جیسا موجودہ زمانے میں بیرونی سکوں کے مبادلہ پر بٹاون لی جاتی ہے یا اندرون ملک میں روپیہ کی ریزگاری مانگنے والوں، یا دس اور پانچ روپے کے نوٹ بھنانے والوں سے کچھ پیسے یا آنے وصول کر لئے جاتے ہیں۔ یہ چیز بھی چونکہ سود خوارانہ ذہنیت ہی کی طرف لے جانے والی ہے اس لئے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دے دیا کہ نہ تو چاندی کا تبادلہ چاندی سے اور سونے کا تبادلہ سونے سے کمی بیشی کے ساتھ کرنا جائز ہے اور نہ ایک درہم کو دو درہم کے عوض بیچنا درست ہے۔

(۳) ہم جنس اشیاء کے درمیان مبادلہ کی ایک صورت یہ بھی ہے کہ ایک شخص کے پاس ایک چیز خام شکل میں ہو اور دوسرے کے پاس اسی جنس سے بنی ہوئی کوئی شے ہو، اور دونوں آپس میں ان کا مبادلہ کرنا

چاہیں۔ اس صورت میں دیکھا جائے گا کہ آیا صنعت نے اس شے کی ماہیت بالکل ہی تبدیل کر دی ہے یا اس کے اندر صنعت کے تصرف کے باوجود ابتدائی خام صورت کی بہ نسبت کوئی بڑا فرق واقع نہیں ہوا ہے۔ پہلی صورت میں تو کمی بیشی کے ساتھ مبادلہ ہو سکتا ہے لیکن دوسری صورت میں شریعت کا منشا یہ ہے کہ یا تو سرے سے مبادلہ ہی نہ ہو یا اگر ہو تو برابری کے ساتھ ہو تاکہ زیادہ ستانی کے مرض کو غذا نہ مل سکے۔ مثال کے طور پر ایک تو وہ عظیم الشان تغیرات ہیں جو روئی سے کپڑا اور لوہے سے انجن بننے کی صورت میں رونما ہوتے ہیں اور دوسرے وہ خفیف تغیرات ہیں جو سونے سے ایک چوڑی یا ایک کنگن بنائے جانے کی صورت میں ہوتے ہیں۔ ان میں سے پہلی صورت میں تو کوئی مضائقہ نہیں اگر ہم زیادہ مقدار میں روئی دے کر کم مقدار میں کپڑا اور بہت سے وزن کا خام لوہا دے کر تھوڑے سے وزن کا ایک انجن خرید لیں۔ لیکن دوسری صورت میں یا تو سونے کے کنگن کا تبادلہ ہم وزن سونے ہی سے کرنا ہوگا[1] یا پھر سونے کو بازار میں بیچ کر اس کی قیمت سے کنگن خریدنے پڑیں گے۔

۲۔ مختلف اجناس کی چیزوں کا باہم مبادلہ کمی بیشی کے ساتھ ہو سکتا ہے مگر شرط یہ ہے کہ معاملہ دست بدست ہو جائے۔ اس شرط کی وجہ یہ ہے کہ دست بدست جو لین دین ہوگا وہ تو لامحالہ بازار کے نرخوں ہی پر ہوگا مثلاً جو شخص چاندی دے کر سونا لے گا۔ وہ نقد سودے کی صورت میں سونے کے بالمقابل اتنی ہی چاندی دے گا جتنی اسے بازار کے بھاؤ کے لحاظ سے دینی چاہیے لیکن قرض کی صورت میں کمی بیشی کا معاملہ اس اندیشہ سے خالی نہیں ہو سکتا کہ اس کے اندر سود کا غبار شامل ہو جائے۔ مثال کے طور پر جو شخص آج ۸۰ تولہ چاندی دے کر یہ طے کرتا ہے کہ ایک مہینہ بعد ۸۰ تولہ چاندی کے بجائے ۲ تولہ سونا لے گا۔ اس کے پاس درحقیقت یہ علم کرنے کا کوئی ذریعہ نہیں ہے کہ ایک مہینہ بعد ۴۰ تولہ چاندی ایک تولہ سونے کے برابر ہوگی۔ لہذا اس نے چاندی

۱؎ یہاں کسی کو یہ شبہ نہ ہو کہ اس طرح تو پھر سنار کا سارا کاروبار بند ہو جائے گا کیونکہ اسے سونے کی بنی ہوئی چیزیں ہم وزن سونے کے عوض فروخت کرنی ہونگی اور اپنی صنعت کی کوئی اجرت نہ لے سکیگا۔ یہ شبہ اس لئے غلط ہے کہ سنار سے دراصل ہم مبادلہ کا معاملہ نہیں کرتے ہیں بلکہ ... اپنے معاوضہ کی چیز بنتے ہیں لہذا وہ صرف اپنے کام کی اجرت لینے کا حق دار ہے جو ایک تولہ یا ایک آنہ ہو۔ البتہ اگر ہم کسی زیور فروش سے بنا بنایا کوئی زیور خریدیں تو یقیناً اسے قیمت میں زیادہ سونا دینا جائز نہ ہوگا بلکہ ہمیں لازماً اسے چاندی یا نقد کے سکے ہی میں قیمت دینی ہوگی۔

اور سونے کے درمیان مبادلے کی اس نسبت کا پیشگی تعین کرلینا یہ بہرحال ایک طرح کی سود خوارانہ اور قمار بازانہ ذہنیت کا نتیجہ ہے، اور قرض لینے والے نے جو اسے قبول کیا تو اس نے بھی گویا جوا کھیلا کہ شاید ایک مہینہ بعد سونے اور چاندی کی باہمی نسبت ۴۰ = ۱ کے بجائے ۳۵ = ۱ ہو۔ اسی بنا پر شارع نے یہ قانون مقرر کیا ہے کہ مختلف اجناس کا مبادلہ کمی بیشی کے ساتھ کرنا ہو تو وہ صرف دست بدست ہی ہوسکتا ہے۔ رہا قرض تو وہ لازماً دو طریقوں میں سے کسی ایک طریقہ پر ہونا چاہیئے۔ یا تو جو چیز جتنی مقدار میں قرض دی گئی ہے وہی چیز اسی مقدار میں واپس قبول کی جائے یا پھر معاملہ اجناس اور اشیاء کی شکل میں طے کرنے کے بجائے روپے کی شکل میں طے کیا جائے۔ مثلاً یہ کہ آج زید نے بکر سے ۲۰ روپے یا ۴۰ روپے کے گیہوں قرض لئے اور ایک مہینہ بعد وہ بکر کو ۲۰ روپے یا ۴۰ روپے کے جو واپس دے گا۔ اس قانون کو ابوداؤد کی اس روایت میں بالکل واضح طور پر بیان کیا گیا ہے۔

ولا بأس ببيع الذهب بالفضة والفضة أكثرهما يداً بيد وأما النسيئة فلا، ولا بأس ببيع البر بالشعير والشعير أكثرهما يداً بيد وأما النسيئة فلا

اور کوئی مضائقہ نہیں اگر سونے کو چاندی کے عوض بیچا جائے اور چاندی زیادہ ہو بشرطیکہ معاملہ دست بدست ہو جائے۔ رہا قرض تو وہ جائز نہیں ہے، اور کوئی مضائقہ نہیں اگر گیہوں کو جو کے عوض بیچا جائے

حضرت عمرؓ کا قول نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے یہ احکام مجمل ہیں اور معاملات کی تمام جزئی صورتوں کی ان میں تصریح نہیں ہے۔ اس لئے بہت سے جزئیات ایسے پائے جاتے ہیں جن میں شک کیا جا سکتا ہے کہ آیا وہ ربوٰ کی تعریف میں آتے ہیں یا نہیں۔ یہی بات ہے جس کی طرف حضرت عمرؓ نے ارشاد کیا ہے کہ:-

ان آية الربا من آخر ما نزل من القرآن وان النبي صلعم قبض قبل ان يبينه لنا فدعوا الربا والريبة

آیت ربوٰ قرآن کی ان آیات میں سے ہے جو آخر زمانہ میں نازل ہوئی ہیں۔ اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا وصال ہوگیا قبل اس کے کہ آپ اس کے تمام احکام ہم پر واضح فرماتے

لہٰذا تم اس چیز کو بھی چھوڑ دو جو یقیناً سود ہے، اور اس چیز کو بھی جس میں سود کا شبہ ہو۔

فقہاء کے اختلافات احکام کا یہ اجمال ہی ان اختلافات کا مبنیٰ ہے جو سودی اجناس کے تعین، اور ان میں تحریم کی علت، اور حکم تحریم کے اجراء میں فقہائے امت کے درمیان ہوئے ہیں۔

ایک گروہ کی رائے یہ ہے کہ ربٰو صرف ان چھ اجناس میں ہے جن کا ذکر نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرما دیا ہے یعنی سونا، چاندی، گیہوں، جو، خرما اور نمک، ان کے سوا دوسری تمام چیزوں میں تفاضل کے ساتھ بلا کسی قید کے لین دین ہو سکتا ہے۔ یہ مذہب قتادہ۔ اور طاؤس اور عثمان البتی، اور ابن عقیل حنبلی اور ظاہریہ کا ہے

دوسرا گروہ کہتا ہے کہ یہ حکم تمام ان چیزوں میں جاری ہوگا جن کا لین دین وزن اور پیمانہ کے حساب سے کیا جاتا ہے۔ یہ عمار اور امام ابو حنیفہ کا مذہب ہے، اور ایک روایت کی رو سے امام احمد ابن حنبل کی بھی یہی رائے ہے۔

تیسرا گروہ کہتا ہے کہ یہ حکم سونے چاندی اور کھانے کی ان چیزوں کے لئے ہے جن کا لین دین پیمانہ اور وزن کے لحاظ سے ہوتا ہے۔ یہ سعید بن المسیب کا مذہب ہے اور ایک ایک روایت اس باب میں امام شافعی اور امام احمد سے بھی منقول ہے۔

چوتھا گروہ کہتا ہے کہ یہ حکم مخصوص ہے ان چیزوں کے ساتھ جو غذا کے کام آتی ہیں اور ذخیرہ کرکے رکھی جاتی ہیں یہ امام مالک کا مذہب ہے۔

درہم و دینار کے بارے میں امام ابو حنیفہ اور امام احمد کا مذہب یہ ہے کہ ان میں علت تحریم ان کا وزن ہے۔ اور شافعی و مالک اور ایک روایت کے مطابق امام احمد کی رائے یہ ہے کہ قیمت اس کی علت ہے۔

مذاہب کے اس اختلاف سے جزئی معاملات میں حکم تحریم کا اجرا بھی مختلف ہوگیا ہے۔ ایک چیز ایک مذہب میں سرے سے سودی جنس ہی نہیں ہے اور دوسرے مذہب میں اس کا شمار سودی اجناس میں ہوتا ہے۔ ایک مذہب کے نزدیک ایک شے میں علت تحریم کچھ ہے اور دوسرے مذہب کے نزدیک کچھ اور، اس لئے بعض معاملات ایک مذہب کے لحاظ سے سود کی زد میں آجاتے ہیں اور دوسرے مذہب کے لحاظ سے نہیں آتے لیکن یہ تمام اختلافات ان امور میں نہیں ہیں جو کتاب سنت کے صریح احکام کی رو سے "ربٰو" کے حکم میں داخل ہیں، بلکہ ان کا تعلق صرف مشتبہات سے ہے اور ایسے امور سے ہے جو حلال و حرام کی درمیانی سرحد پر واقع ہیں۔ اب اگر کوئی شخص ان اختلافی مسائل کو حجت بنا کر ان معاملات میں شریعت کے احکام کو مشتبہ ٹھیرانے کی کوشش کرے جن کے سود ہونے پر نصوص صریحہ وارد ہو چکی ہیں اور اس طریق استدلال سے رخصتوں اور حیلوں کا دروازہ کھولے اور پھر ان دروازوں سے بھی گزر کر امت کو سرمایہ داری کے راستوں پر چلنے کی ترغیب دے تو وہ خواہ اپنی جگہ نیک نیت اور خیر خواہ ہی کیوں نہ ہو حقیقت میں اس کا شمار ان لوگوں میں ہوگا جنھوں نے کتاب و سنت کو چھوڑ کر ظن و تخمین کی پیروی کی خود بھی گمراہ ہوئے اور دوسروں کو بھی گمراہ کیا